سعتیں

سلام

مکتبۂ اردو لاہور

وسعتیں

سلام مچھلی شہری

مکتبۂ اردو لاہور

(دائمی حق اشاعت بحق مکتبۂ اردو لاہور محفوظ)

چوہدری نذیر احمد پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع کی

تصوّرو ـــــ مری معصوم و مضطرب نظمو ـــــ!
تمہیں اُداس نظارے فسانہ کر پائیں
یہ آسمان کی گہرائیاں، یہ بحرِ سکوت
شکستہ ساز پہ فطرت ہو جیسے نوحہ کناں
شفق کی، نرم منازل، افق کے تیز غبار
نہ جانے کتنی امنگوں کے قافلے پنہاں
نہ عکسِ انجمِ رقصاں، نہ موجِ آبِ رواں ـــــ!!
تم آسمان کی اِن وسعتوں پہ چھا جاؤ
اٹھیں گی آپ ہی لہریں، کھلیں گے خود ہی نجوم ـــــ!!!

"اپنے مستقبل کے نام"

فہرس

دستیں، ۳

. . . . . .

مجھے وہ نظم لکھنی ہے، ۹

دنیا اِک انگڑائی لے گی، ۱۱

بکھری ہوئی پتیاں، ۱۵

ایک گیت ، ۱۷

سات رنگ، ۲۰

خاموش رہو، ۲۳

آرائش، ۲۵

سویرے، ۲۹

ڈرائنگ روم، ۳۱

انٹرویو، ۳۳

ایسا کیوں ہوتا ہے، ۳۴

تاج محل، ۳۶

محدود سُرخیاں، ۳۸

آنکھیں ، ۴۰

زرد چراغ، ۴۳

حسین ارادے، ۴۵

فانی بدایونی، ۴۷

تتلیاں، ۴۸

آگ کی کلیاں، ۴۹

چوک، ۵۳

افشاں، ۵۴
سڑک بن رہی ہے، ۵۶
ایک عورت، ۵۸
مہینوں کے گیت، ۶۱
شام، ۷۰
بھینٹ، ۷۱
اندیشہ، ۷۳
ہاجرہ سے، ۷۴
سیّاح سے، ۷۶
پُوجا، ۷۸
آپ، ۸۰
انتشار، ۸۱
پیتل کا سانپ، ۸۳
ناکامی، ۸۷
جنگل کا ناچ، ۸۸
پلکوں کی چھاؤں میں، ۹۰
ٹھیس، ۹۲
قُلی، ۹۴
جنگ، ۹۵
ٹوٹا ہوا ریکٹ، ۹۶
قیدی عالمِ سکرات میں، ۹۹
مال روڈ ــــ لکھنؤ، ۱۰۲
پناہ، ۱۰۴
سپیشل ٹرین، ۱۰۶
نغمۂ خواب، ۱۰۷
رومال کے پھول، ۱۰۹
منکی برج، ۱۱۰
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے، ۱۱۳
بنگال کی رقاصہ، ۱۱۷

مجھے وہ نظم لکھنی ہے

مجھے وہ نظم لکھنی ہے
کہ ہر اندازِ موسیقی سے دہرایا کروں جس کو
مگر اکتا نہ جاؤں بار بار اپنے ہی گانے سے
یوں ہی بس زندگی کے ساز پر گایا کروں جس کو
مگر گھبرا نہ جاؤں زندگانی کے فسانے سے
مجھے وہ نظم لکھنی ہے
کہ جس میں لذتِ رد و مان و موسیقی تو ہو لیکن
حیات و وقت کے کچھ اور نظّارے بھی پنہاں ہوں
شبیہِ حسن میں پھولوں کی رنگینی تو ہو لیکن
انہیں کے ساتھ کچھ افسردہ انگارے بھی پنہاں ہوں

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :-

کہ جس میں زہر و ناہید سب رقصاں تو ہو لیکن،
کبھی مزدور کے اندوہگیں رخسار بھی دیکھوں
ہزار دل رقص ہائے دلنشیں پنہاں تو ہوں لیکن
کبھی تلوار کی ہیبت فزا جھنکار بھی دیکھوں

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :-

کہ جو سازِ حیاتِ وقت پر آتی تو ہو لیکن
کسی موزوں سی دھن کے واسطے محنت بھی کرتی ہو
عروسِ زندگی پر پھول برساتی تو ہو لیکن
حیاتِ نو کی خاطر جنگ کی جرأت بھی کرتی ہو

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :-

کہ جس کو موت کی آواز سے نفرت تو ہو لیکن
پیامِ زندگی کچھ حوصلہ ساماں بھی ہوتا ہو
بہارِ زندگی عبرت وہ جنت تو ہو لیکن
غریب انسان اس جنت سے کچھ شاداں بھی ہوتا ہو

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :-

دنیا اک انگڑائی لے گی

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
دنیا اک انگڑائی لے گی
چاند ستارے ٹوٹ پڑینگے
آتش پارے ٹوٹ پڑینگے

انگاروں کی بزم سجے گی
جلتی سانسیں رقص کریں گی
مُردہ روحیں رنگ بھریں گی

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
نازک اور شرمیلی سڑکیں
زخمی، کوڑھی ہو جائیں گی
اِنسانوں سے گھبرائیں گی

ہم اُن پر چلتے ہی رہیں گے
یہ گُل بُوٹا بن جائیں گی
پھر اک شعلہ بن جائیں گی

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا!
پانی میں دوزخ گائے گا
لہریں ساز بداماں ہوں گی
عرش کی پریاں رقصاں ہونگی

سُرخ سمندر ٹھنڈا ہو گا
لہریں مدھم ہو جائیں گی
زہرہ و پروین سو جائیں گی

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا
اوپر طیّارے گرجیں گے
نیچے سُکھ کا گیت چھڑے گا
ہلکا ہلکا ساز بجے گا

ساز کے تار بھی جل جائینگے
گیت دھوئیں میں اُڑ جائیگا
ساز فضا میں تھرّائے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا

زرّیں کتبے اور مینارے
آگ کے شعلوں میں کانپیں گے
پاپ کے سائے میں ہانپیں گے

پھر کچھ پرچم لہرائیں گے
پھر کوئی تاریخ لکھیں گے
اپنی اپنی طرح پڑھیں گے

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا

دنیا اک انگڑائی لے گی
چاند ستارے ٹوٹ پڑیں گے
آتش پارے ٹوٹ پڑیں گے

تم ان تاروں کے جھرمٹ سے
میرا ساز اٹھا لاؤ گی
کوشش کر کے کچھ گاؤ گی

اپنے ہی گیتوں سے تمہاری
آنکھیں رنگیں ہو جائیں گی
پھر کچھ غمگیں ہو جائیں گی

تم یہ کہو گی آج تو خوش ہوں
دل یہ کہے گا روتی کیوں ہو
اپنی خوشی میں کھوتی کیوں ہو

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا

یہ سب کچھ ہوتا ہی رہے گا
جب تک دنیا تھک نہ چکے گی
چاند ستارے مر نہ چکیں گے
یہ نظّارے مر نہ چکیں گے

دُھندلی اور بے جان زمیں سے
جب تک ایک نیا سیّارہ
پھر نہ حسیں بن کر اُبھرے گا

دنیا اک انگڑائی لے گی ——————!!!

میری فطرت!

ابھی ابھی میری آنکھوں میں اشک بھر آئے
ابھی ابھی میں مسرّت سے مسکرا اُٹھا
ابھی کہ تھی مری تخئیل زلفِ آوارہ
میں ایک شعرِ نیا شعر گنگنا اُٹھا

بکھری ہوئی پتّیاں

اے دوست! پھر بھی میری پریشانیاں یہ کیوں
تاریخِ باغِ دہر کو ترتیب دے چکا
منظوم گلستاں کی بہاریں بھی لے چکا
لیکن پڑی ہیں بکھری ہوئی پتّیاں یہ کیوں؟

مدّت سے ایک فکر ہے صدیوں سے کوششیں
لیکن ہوئیں نہ آج تک افسوس کامیاب
یعنی ابھی ہر ایک تغیّر، ہر انقلاب
کھاتا رہا ہے چار قدم چل کے ٹھوکریں!

یہ نظم، یہ فسانہ، یہ تقریر، یہ پکار
اسٹیج سے زمانہ کے سو سُرخیوں کے ساتھ
ان منتظر سی تکتی ہوئی ہستیوں کے ساتھ
کس درجہ دلفریب مگر کتنا انتشار

کر شور اے حیات۔ کہ سمجھی نہیں ہیں میں
اے زندگی۔ پکار کہ اندوہگیں ہوں میں

ایک گیت

(تین لہریں)

پہلی لہر

"میں دیکھ ہی رہی تھی، میرے دل کا باغ کھل گیا
سُہانے پھُولوں میں کہیں چھپا تھا گیت، مل گیا
ستار چھیڑنے لگی
میں اِک حسین راگ میں ملہار چھیڑنے لگی
— ارے بہار جا چکی
کلی بھی مُسکرا چکی
ابھی ہزاروں گیت ہیں، چلو یہ گیت گا چکی!"

دُوسری لہر

"میں سوچ ہی رہی تھی، آج اتنا کیوں ملول ہوں
وُہ کہہ رہے تھے، میں ہمیشہ ایک تازہ پھُول ہوں
اسی خیال و خواب میں
میں ڈوب سی گئی تھی اس خیال کی شراب میں
— ارے وُہ جیسے آ گئے
نہ جانے کِتنے خواب چاند تارے بن کے چھا گئے
فضا نے ساز لے لیا
کسی نے بڑھ کے بوسۂ بہارِ ناز لے لیا
پھر ایک گیت مل گیا
میں سوچ ہی رہی تھی، میرے دِل کا باغ کھِل گیا"

تیسری لہر

"مَیں چھیڑ رہی تھی ساز، خواب ناچتے رہے

ہزاروں ماہتاب و آفتاب ناچتے رہے
زمانے گیت بن گئے
زمانے بھر کے منتشر فسانے گیت بن گئے
—میں جب بھی شادماں ہوئی
فضائے زندگی بھی میرے ساتھ نغمہ خواں ہوئی
میں جب بھی کچھ اُداس تھی
بہارِ زندگی مرے لئے پیامِ یاس تھی
نیا ترانہ کچھ نہیں
قسم ہے زندگی میں یہ نیا فسانہ کچھ نہیں
چمن خوشی کا کھل گیا
میں چاہتی تھی اس لئے حسین گیت مل گیا—!!

سات رنگ

تصویر وہ بناؤں کہ مسحور ہو سکوں
ایسے خطوط کھینچوں کہ مغرور ہو سکوں

(۱)

اِک نوجواں کو شہر میں تشویشِ روزگار
اور دور ایک گاؤں میں برسات کی بہار
ہاتھوں میں اک حسینہ کے ٹوٹا ہوا ستار!

(۲)

دریا سے ہٹ کے سامنے چھوٹا سا ایک گاؤں
پگڈنڈیوں سے دور گھنے پیپلوں کی چھاؤں
وہ دھندلی دھندلی صورتیں، وہ میلے میلے پاؤں!

(۳)

موجوں کے رُخ پہ چھوٹی سی کشتی رواں دواں
دریا کے اِس بہاؤ سے ملّاح بدگماں
ساحل کے ایک جھونپڑے میں موت کا سماں

(۴)

کچھ لوگ محوِ سیرِ چمن زارِ شالامار
ہنستا ہے سامراج کی دولت کا شاہکار
پھاٹک پہ ہٹکے میلے فقیروں کی اک قطار!

(۵)

سونے کا ماہتاب مناروں کے درمیاں
چاندی کا آفتاب چناروں کے درمیاں
اور اک "خدا" فضائی نظاروں کے درمیاں

۶

زنداں کی ایک شمع پہ پروانے مضطرب
اور اپنی اپنی فکر میں دیوانے مضطرب
باہر حیاتِ تازہ کے افسانے مضطرب!

(۷)

سڑکوں پہ انقلاب کی گونجی ہوئی صدا
کالج کے ایک "ہال" میں دنیا پہ تبصرہ
اک نوجواں کے ہاتھ میں "اخبار آج کا"

موضوع اتنے، جیسے کہ گھبرا رہا ہوں میں
شاید کہ اپنے فکر پہ خود چھا رہا ہوں میں

خاموش رہو

لاچار ہوں۔ دکھیا ہوں بابو!
دو روز سے بھوکا ہوں بابو!
"خاموش رہو!"

بابو! رومال کی حاجت ہے؟
دو آنے اس کی قیمت ہے؟
"خاموش رہو!"

اندھے کی خبر بھی لو بابا!
اللہ کے نام پہ دو بابا!
"خاموش رہو!"

سرکار یہ بھاری بوجھ ہے
ایک آنہ اِس کا تھوڑا ہے!
"خاموش رہو!"

کیا چھُوت ہے بابا جانے دو
مندر میں پھُول چڑھانے دو!
"خاموش رہو!"

آرائش

—— اور اس ریشمی رومال کے دام؟
ہاں یہ سینٹ اور یہ غازہ، یہ کریم اور سُرخی؟
لیکن اس ہار کی قیمت، وُہ سنہرے بُندے؟
—شکریہ، اپنے ملازم کو میں کل بھیجوں گی؟

—میرے کپڑے تو اُٹھانا کہ مجھے سجنا ہے
اس بلاؤز کے کنارے تو پھٹے ہیں شیلا!
کیسی عورت ہو، یہ ساری بھی یونہی رکھی ہے
مجھکو ملنا ہے کسی سے تمہیں معلوم نہ تھا!

—آئینہ صاف نہیں، کنگھے کی یہ حالت ہے
اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنواروں کیسے
لو—یہ اسنو بھی نہیں دیکھو یہ سُرخی بھی نہیں
اور بُندے بھی یہی ہیں، میں اُتاروں کیسے

خیر، یہ کپڑے اب اتنے بھی بُرے کیا ہوں گے
اُن کے محبُوب حسینوں کو بھی میں جانتی ہوں
لیکن ایسے میں کہ پچھر بھی مجھے جانا ہے
اور مخصوص نگاہیں بھی میں پہچانتی ہوں

جانے کیا بات ہے آئینے میں اپنی صورت
آج کل مجھکو کچھ افسردہ نظر آتی ہے
وُہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی بازو، وہی لب
پھر بھی کچھ فطرتِ مغرور کمی پاتی ہے

یہ بھی کیا دن ہیں کہ آرائشِ گیسُو کے لئے
اپنے آئینۂ نازک پہ خفا ہوتی ہوں
یہ بھی کیا دن ہیں کہ رخسار پہ غازے کیلئے
اپنے ماحول کی تلخی سے جُدا ہوتی ہوں

— اچھا شیلا! میں چلی — کوئی اگر آجائے
اس سے کہنا کہ میں دو تین بجے آؤنگی
سوچتی ہو کہ پیانو سے میں کیوں برہم ہوں

دیکھنا، لوٹ کے اک تازہ غزل گاؤں گی!

میں سمجھتی تھی مجھے دیر ہوئی جاتی ہے
اور یہاں تو ابھی ساماں کئے جاتے ہیں
انتظار — اور مرے واسطے، جانے دیجے
دیکھئے، آپ پشیماں کئے جاتے ہیں

— ہاں تو پھر آپ کی تعریف ہی فرمائیے کچھ
در شاہدہ — ! اسم مُبارک تو بہت پیارا ہے
آپ کو میں نے جہاں تک مجھے یاد آتا ہے
آرٹ اسکول میں پہلے بھی کہیں دیکھا ہے!

— آپ پھل کھائیے، میں چائے بنا دیتی ہوں
کیسے چُپ چُپ سے ہیں، فرمائیں شکر کتنی دوں
مجھے نظروں کے دھوئیں میں نہ چھپا، دُر کاش!
میں تو سرکار کی سگریٹ ہی کا ہلکا کش ہوں

— پارٹی ختم ہوئی مجھکو بھی گھر جانا ہے
آپ دونوں یہی بہتر ہے کہ پکچر ہو آئیں

نامبارک ہے، اگر فلم کے دلکش پردے
ایک رومان بھرے سین پہ آ کر ٹھہرائیں

— آؤ شیلا! میں پیانو پہ غزل گاتی ہوں
چاند سے چہرے پہ رقصاں ہیں سنہرے بندے
شاہدہ کایہ حسیں جسم، یہ نیلی ساری
جیسے اک میز پہ چاندی کا کوئی بت ناچے

یہ غزل ٹھیک نہیں، گیت سُنے گی شاید
گیت — سجتے ہوئے اک نازنین گاتی ہے جسے
گیت — رنگِ لب و آرائشِ گیسو کی طرح
اک سہیلی تری بستر پہ سجاتی ہے جسے

اُف! مشینوں کی یہ چیخیں، ارے توبہ یہ جہاز
کھڑکیاں بند کرو، بند کرو دروازے
اپنے کمرے میں ہوں، گاؤنگی، ہیں گاؤنگی ضرور
منتشر ہونے نہ پائیں مرے زخمی نغمے — !!

سویرے

— آج طوفاں کی شدّت کم ہے
اور فضا کا بھی دردمدھم ہے — ناؤ کچھ تیز چلا اے مانجھی!
ہولے ہولے کوئی سہانا گیت
اک نئے راگ میں پرانا گیت
جی میں آئے تو سنا اے مانجھی!

جبکہ مدّت سے حشر طاری ہو
آج یہ صبح کیوں نہ پیاری ہو
کون جانے کہ رات بھاری ہو
قربِ منزل کا جگمگاتا گیت
کارواں کا اُمید افزا گیت
لے ذرا تیز اُٹھا اے مانجھی!

—— دوپہر سر پہ آئی جاتی ہے
پھر فضا تلملائی جاتی ہے
آگ سی ہے کہ چھائی جاتی ہے —— وُہی طوفان آئے جاتے ہیں
ایسے آثار پائے جاتے ہیں
بادباں ڈگمگائے جاتے ہیں

تیز —— لیکن ذرا گلابی گیت
چھاؤں میں ایک آفتابی گیت
شام غمگیں ہے تو کیا اے مانجھی!
ہم سمجھتے ہیں فضا کے تیور
دیکھتے ہیں یہ بھیانک منظر —— چاند نکلا ہے سلاسل کے قریب
روشنی قید ہے ساحل کے قریب

—— یونہی اس کو نہ ٹھہر جانے دے
ہاں یہ جھونکا نہ گزر جانے دے —— ہم چٹانوں سے گھرے جاتے ہیں
وُہی طوفاں بڑھے آتے ہیں
اِن سے ٹکرا ہی نہ جا اے مانجھی —— !!!

ڈرائینگ روم

یہ سینری ہے، یہ تاج محل، یہ کرشن ہیں اور یہ رادھا ہیں
یہ کوچ ہے، یہ پائپ ہے مرا، یہ ناول ہے، یہ رسالہ ہے
یہ ریڈیو ہے، یہ بجلی ہے، یہ میز ہے، یہ گلدستہ ہے
یہ گاندھی ہیں، ٹیگور ہیں یہ، یہ شامنشہ، یہ ملکہ ہیں!
—— ہر چیز کی بابت پوچھتی ہے، جانے کتنی معصوم ہے یہ
—— ہاں، اِس پر رات کو سونے سے میٹھی میٹھی نیند آتی ہے
ہاں، اُس کے دبانے سے بجلی کی روشنی گُل ہو جاتی ہے

سمجھی کہ نہیں، یہ کمرہ ہے۔ ہاں، میرا ڈرائنگ روم ہے"
— اتنی جلدی مزدور عورت! آخر یہ گلے میں باہیں کیوں

لے، دیر ہوئی، اب بھاگ بھی جا، بس اتنی محبت کافی ہے
اس ملک کے بھوکے پیاسوں کو پیسے کی حاجت کافی ہے

اتنی ہنس مکھ خاموشی، اتنی مانوس نگاہیں کیوں؟
— میں سوچ رہا ہوں کچھ بیٹھا بیٹھا یا یہ کچھ دھوئیں کے بادل ہیں
میں چھپ سا گیا ہوں اک نازک احساس کے میلے آنچل میں

انٹرویو

—یہی پطرس کے مضامین کا ہیرو اے دوست!
مرے آغازِ تخیل کا خدا تھا شاید!
میں نے معصوم خیالوں کے چمن زاروں میں
یاد پڑتا ہے کہ بچپن میں بلایا تھا اِسے
ابھی کچھ روز ہوئے، ایک پریشان سا گیت
بربطِ ماہ کے تاروں پہ سنایا تھا اِسے
اپنے افکار کا معبود بنایا تھا اِسے!
—آج بھی پھول عقیدت کے چُنے ہیں لیکن
نذر کرتا ہوں تو کچھ سوچ رہا ہوں دل میں—!!

ایسا کیوں ہوتا ہے؟

دُنیا کی مغرور خوشی سے میں بھی اثر لے ہی لیتا ہوں
دوست جب آپس میں ہنستے ہیں میں بھی یوں ہی ہنس دیتا ہوں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

پردۂ سیمیں پر جب کوئی نازک دوشیزہ گاتی ہے
میرے آنسو ہنس دیتے ہیں، میری دُنیا کھو جاتی ہے
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

رات کو جب ناول کے رنگیں باب پہ آنے لگتا ہوں میں
موسیقی سی رومانی جذبات میں پانے لگتا ہوں میں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے

کہتا ہوں نیچر میں کھو کر یہ نظّارے میرے ہوتے
کاش یہ کلیاں میری ہوتیں، کاش یہ تارے میرے ہوتے!
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے

مزدوروں کے خونی پرچم کے نیچے جب آتا ہوں میں
اپنی قوت سے خوش ہو کر باغی نظمیں گاتا ہوں میں
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟

"تاج محل" کے رہبر جس دم پچھلے قصّے دہراتے ہیں
شاہی کا دشمن ہوں لیکن پھر بھی آنسو آجاتے ہیں!
ایسی صورت میں کیا جانے آخر ایسا کیوں ہوتا ہے

تاج محل

صرف تصویر تری دیکھی ہے
سطحِ جمنا پہ شبِ ماہ کے سائے میں کبھی
صُبح یا شام کے موہوم دھندلکے میں کبھی
دامنِ ابر پہ ساون کے اندھیرے میں کبھی
صرف تعریف سُنی ہے تیری
عہدِ حاضر ہی کے رنگین فسانوں سے کبھی
کسی سیّاح کے مغرور بیابانوں سے کبھی
ایک شاعر کے تخیّل کی زبانوں سے کبھی

اور اگر میں بھی تجھے دیکھ سکوں

ایک افسُردہ سا مہتاب سمجھ لوں شاید
اپنا ہی دیدۂ پُر آب سمجھ لوں شاید
یا پھر اِک بھُولا ہوا خواب سمجھ لوں شاید

مجھ سے شاعر کیلئے یہ تو نئی بات نہیں

میں تجھے قلعے کی چوٹی سے کبھی دیکھوں گا
میں تجھے جمنا میں کشتی سے کبھی دیکھوں گا
میں تجھے پاس کی وادی سے کبھی دیکھوں گا
اور یہ سوچتا لوٹ آؤں گا ——

نقشِ مرمر سے سُبک، شیشۂ رنگیں سے حسیں
میں نے اِک چوٹ سی کھائی ہے ابھی اور یہیں
میرے دل میں کوئی مخصوص خوشی پھر بھی نہیں۔!!

محدود سرخیاں

یہ پھول - یہ کلیاں - یہ سبزہ - کچھ دور یہ شاما کے نغمے
یہ چاند - یہ تارے - یہ بادل - کچھ دور یہ زہرہ کے نغمے
یہ جھیل - یہ چشمہ - یہ وادی - کچھ دور یہ دریا کے نغمے
ایسے میں جو "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو

یہ آم - یہ جامن - یہ بارش - کچھ دور کسانوں کے نغمے
بالوں کی گھنی محفل سے پرے یہ نازک دھانوں کے نغمے
کچھ دور ندی کے پورب میں خاموش مکانوں کے نغمے
اور ایسے میں "منظرِ فطرت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

یہ چاندنی۔ یہ سیمیں لمحے۔ کچھ دور، فضا میں نغمہ سا
یہ وقت۔ یہ چھت۔ یہ تنہائی جیسے کہ ہوں میں کھویا کھویا
یہ میز پہ شیلے کی نظمیں اور دھیان میں کالج کی زہرہ
ایسے میں جو "حسن و الفت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو

مٹی کے یہ گھر۔ یہ آبادی۔ یہ سرد مسرت کی دنیا
کچھ دور، منگیتر کا میری، چکی پہ محبت کا نغمہ
اور میں کہ صدا سے چکی کی کچھ گھبرایا۔ کچھ بے پروا
اور ایسے میں "حسن و اُلفت" پر اِک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

یہ مہمانداری کی گھڑیاں۔ یہ "تاج محل" کا کاشانہ
یہ میز۔ یہ کرسی۔ یہ بجلی۔ یہ موپاساں کا افسانہ
دنیا کے نمایاں حصّے میں دنیا والوں سے بیگانہ
ایسے میں جو "اپنی حالت" پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو

یہ میرے محلے کی گلیاں۔ قصبے کی یہ مبہم رعنائی
یہ شمع۔ یہ تخت۔ یہ جاڑے میں سب گھر والوں کی یکجائی
کچھ دور انگیٹھی سے میری یہ سوچ، یہ پھیکی انگڑائی
ایسے میں اپنی حالت پر اک نظم لکھوں تو کیسی ہو؟

آنکھیں

آنکھوں سے کچھ کلیاں برسیں
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ــــ!
ہلکی ہلکی نرم پھوار
ایک شرابی ہار سنگھار
ناچ رہا تھا لیکے ستار

آنکھوں سے کچھ تارے ٹوٹے
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ——!
دھیما دھیما میٹھا راگ
گاتی تھی کلیوں کی آگ
سازِ جوانی، گیت سہاگ

آنکھوں سے کچھ صہبا چھلکی
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ——!
رقصاں رقصاں جام و شراب
عریاں عریاں حسن و شباب
خنداں خنداں رنگیں خواب

آنکھوں سے دو آنچل ڈھلکے
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ——!
"چھم چھم" پائل کی آواز
جام و صراحی کی پرواز
ساقی کے ہاتھوں میں ساز

آنکھوں سے اک چاندنی چھٹکی
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ـــــ!

بادل کی بے ربط قطار
ہلکے اور گہرے کہسار
دُور فضائیں آتشبار

آنکھوں سے دو آنسو ٹپکے
اور پھر تھوڑی دیر کے بعد ـــــ!

زلزلے آندھی اور طوفاں
سازِ تخیّل میں ہیجاں
چیخ رہا تھا نازک دھیاں

زرد چراغ

گل کرو، پھینک دو، پہلے ہی سے یہ زرد چراغ
آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہیں

(۲)

ملگجی شمع کے پرتو میں جوانی کا خمار
خود بخود اک نئے احساس سے تھرّا جائے
مجھ کو منظور نہیں، میری مسرت کی بہار
ایک مغموم تصوّر ہی سے گھبرا جائے

(۳)

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پُرانا ملبوس
جسمِ افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
رات کے وقت بہر حال یہ نیلا فانوس
تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

(۳)

کل یہی ساز، یہی گیت، یہی جامِ شراب
جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھرّاتے تھے
رات یہ شمع، یہ تارے، یہ سنہرا مہتاب
خلوتِ عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے
دُھندلے دُھندلے سے اِنہیں ریشمیں پردوں کے اُدھر
حسنِ غمگیں کے نظارے بھی یہاں کیوں دیکھوں
جن کے چہروں میں مجھے اپنے گُنہ آئیں نظر
ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں دیکھوں

ہاں، ہٹا دو، مری نظروں سے یہ پُر درد چراغ
میرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

حسین ارادے

وہ دیکھو آسماں پر اک ستارہ جھلملاتا ہے
مجھے اس کو جبینِ ناز کی افشاں بنانا ہے
خدا سیرِ فلک کو کہکشاں کی راہ آتا ہے
مجھے پھولوں بھرے رستے سے تم کو گھر بلانا ہے
چھپا کر چاند کو دامن میں بادل مسکراتا ہے
مجھے بھی اس حسیں پہلو میں اِک دن مسکرانا ہے
افق پر آتشیں پوشاک میں خورشید آتا ہے
مجھے بھی چھیڑ کر اِک دن تمہیں غصّے میں لانا ہے
کوئی قوسِ قزح کو آسماں پر جگمگاتا ہے
مجھے کیوں پڑ گئی اس رنگیں کماں کو آزمانا ہے

زمیں تک اَبر بوندوں کے حسیں زینے لگاتا ہے
مجھے اِن پر تمہیں لیکر فضا سے دُور جانا ہے

تصوّر آسماں کے اس طرف اِک گیت گاتا ہے
مجھے تم کو اِسی دُھن میں کوئی نغمہ سنانا ہے

وہ دریا تار ہائے موج پر کچھ گنگناتا ہے
مجھے ان انگلیوں سے ساز پر اِک گیت گانا ہے

پہاڑی کے کنارے آبشار اک گیت گاتا ہے
مجھے بھی اک فسانہ نظم میں تم کو سنانا ہے

قسم ہے "منظرِ فطرت" یہی پیغام لاتا ہے
قسم ہے منظرِ فطرت پہ اک دن تم کو چھانا ہے

ذرا ان منظروں کو اور بھی رنگیں تو ہونے دو
ذرا میرے تخیّل کو طرب آگیں تو ہونے دو

فانی بدایونی

سرد مہر و ماہ میں   پھر رہا تھا اِک شباب
گلستانِ دہر میں   رو رہا تھا اک گلاب
آنسوؤں کی نہر میں   بج رہا تھا اک رباب

آنسوؤں کی بھی فضا   مستقل نہ رہ سکی
غم کی بھی خنک ہوا   دیر تک نہ بہ سکی
ایک غم زدہ صدا   داستاں نہ کہہ سکی

مستقل نہ بج سکے   سازِ غم کے تار بھی
آج ٹوٹ ہی گئے   تارِ نغمہ بار بھی
دیر تک نہ سن سکے   موت کی پکار بھی

تتلیاں

پھول بر خود غلط گلستاں کے — آج کچھ اس طرح سے نکھر آئے
جیسے زہرہ کے ہاتھ کی چوڑی — ٹوٹ کر آسماں سے گر جائے

رنگ و بو کے حسین جھرمٹ میں — کوئی نازک سی چیز لرزاں ہے
ہو کے دوپارہ پھول کی پتی — شاخِ گل کی طرف خراماں ہے
جیسے قوسِ قزح کا اک ٹکڑا — آسماں کی فضاؤں سے آئے
اور پھر چوم کر گلستاں کو — آسماں ہی کی سمت اُڑ جائے

باغ میں جیسے ایک دوشیزہ — کوئی رنگین خط پڑا پا لے
اور پھر پڑھ کے ایک دو جملے — غصے میں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے

دوست! تم کہہ رہے ہو ہم اور وہ — پھر انہیں لفظوں میں کھو جائیں
ہاں اگر دوسرے جنم میں ہم — "تتلیاں" گلستاں کی ہو جائیں!

آگ کی کلیاں

دیر تک اپنی نگاہیں نہ ملانے دو مجھے
سادے سادے سے سُبک اور تر و تازہ کنول
دیکھتا ہوں کہ گُلابی سے ہوئے جاتے ہیں
جیسے کچھ یہ بھی شرابی سے ہوئے جاتے ہیں!
میں سمجھتا ہوں، کسی جھرنے سے گرتے ہوئے پُھول
کِتنے معصوم فرشتوں کی خوشی ہوتے ہیں!
دیکھتا ہوں کہ ضیا بار و حیا کیش نجوم
کِسی موہوم دھندلکے کی طرف جاتے ہیں
اِن کو روکو، انہیں تاریک نہ ہونے دو ابھی!
مجھکو کیا میری نگاہوں کو بھلا کیا پروا
رات پھر چاند ستاروں کی طرف اٹھیں گی ——!!!

اپنے نازک سے یہ رخسار نہ چھونے دو مجھے

دیکھتا ہوں کہ مرے ہاتھ کی گرمی پا کر
گنگنا اُٹھتے ہیں مہتاب کے پاکیزہ خطوط
اور نکھر آتا ہے پاکیزہ کتابوں کا شباب
میں سمجھتا ہوں یہ ہلکی سی گلابی لہریں
کتنے پھولوں کی جوانی کو لئے اُٹھی ہیں
بجلیاں کتنی ہی ملبوس کئے اُٹھی ہیں!
— ہاں تو اس ہاتھ میں پھیلی ہوئی تاریک رگیں
چاند کو جال میں کتنے ہی اُبھر آتی ہیں
بجلیاں پھولوں کے آنسو میں سنور آتی ہیں
کسی مہتاب و گل افروز جوانی کے لئے !!

ان حسیں ہونٹوں پہ یہ ہونٹ نہ رکھنے دو مجھے

مَیں نے دیکھا ہے انہیں پھولوں کی پنکھڑیوں سے
ہر نئی صبح کو اِک سانپ گزر جاتا ہے

مَیں نے محسوس کیا ہے کہ شفق کی لہریں
میرے چھوتے ہی ہم آہنگ سی ہو جاتی ہیں
گونجنے لگتے ہیں نغمے کسی میخانے کے
اور مرے ہونٹ، مرے بھُورے زہریلے ہونٹ
پھُول کو ڈس کے بڑے چین سے سو جاتے ہیں
جیسے ناگن کیلئے موت کوئی جُرم نہیں ——— !!!

باغِ فردوس کے یہ پھُول نہ چُننے دو مجھے
دیکھتا ہوں کوئی آوارہ، شرابی نغمہ
اِن حسیں پھولوں کو مخمور کئے دیتا ہے
میرے ہاتھوں میں یہ زہریلی شعاعوں کی تڑپ
ساغرِ مے کو شرر بار کئے دیتی ہے!
میں سمجھتا ہوں کہ ان پھولوں میں پیمانوں میں
کتنی خاموش تمناؤں کی رقصاں ہے شراب
ناچتے پھرتے ہیں کتنے گل و مہتاب و نجوم!

بجلیوں کا یہ حسیں رقص، یہ زہریلا شباب
باغِ فردوس کو تاریک کئے دیتا ہے
یہ حسیں پھول اندھیرے میں مسل جائیں گے
اور مرے ہاتھ، یہ کانٹوں بھرے ناپاک سے ہاتھ
صبح ہوتے ہی کسی پھول کو چن لائیں گے ——!!!

اپنے بازو کا سہارا ابھی نہ لینے دو مجھے
دیکھتا ہوں کہ اجنتا کے حسیں نقش و نگار
مرمریں باہوں پہ رقصندہ ہوئے جاتے ہیں
نغمہ و رقص وہی زندہ ہوئے جاتے ہیں
مجھ کو معلوم ہے چاندی کی سُبک ڈالی میں
کتنی کلیاں ابھی پل بھر میں سنور اُٹھی ہیں
کتنی زہریلی ہواؤں نے اُنہیں گھیرا ہے
—— مجھکو کیا میرے لئے آگ کی ان کلیوں میں
کوئی نغمہ، کوئی پیمانہ —— کوئی جسمِ حسیں —— !!!

چوک

طویل و تنگ سڑک پر ہر اک طرف سرِ بام
یہ عورتیں، یہ جوانی، یہ حُسنِ منظرِ عام

یہی ہیں "چوک" کے کوٹھے، یہی ہیں نظّارے
اُبل رہے ہیں جہاں لذّتوں کے فوّارے

یہ جسمِ نیم برہنہ یہ نقرئی باہیں
کہ خواہشاتِ جواں دیکھ کر بھریں آہیں

کوئی جوان و حسیں، اور جانِ نغمہ و ساز
کوئی سیاہ، ادھیڑ عمر اور بے آواز

کوئی تو برق سے خلوت کو جگمگائے ہوئے
کوئی چراغ ہی دیوار سے لگائے ہوئے

کہیں چھلکتی ہوئی سُرخ ریشمیں ساری
کہیں سفید ہی ساری پہ اک سیہ دھاری

کہیں تو مولوی، پنڈت، نواب، ساہوکار
کسی کے پاس اِک آوارہ فاقہ کش نہ مے خوار

یہ عورتیں کہ "طوائف" پکاری جاتی ہیں
اسی سماج کے ہاتھوں سنواری جاتی ہیں

افشاں

وہ بصد حجاب آئیں
چاند اور ستاروں کی
پُر ہی تھی پرچھائیں
جل ترنگ تاروں کے
اُن کو کیا خبر میرے
آنسوؤں پہ بجتے تھے
نظم تھرتھرا اُٹھی
زندگی ستاروں میں
میری، مسکرا اُٹھی

سازِ لے لیا میں نے
کانپتا ہُوا نغمہ
پھر بھی گا دیا میں نے
تارے ٹوٹ کر برسے
میں نے اپنے دامن میں
چُن کے انگوڑے ڈالے
"آپ کچھ پریشاں ہیں" —
"جی نہیں، مِری نظمیں
آنسوؤں کی افشاں ہیں!"

نغمہ

میں نے کل خواب میں جو نظم مکمل کی ہے
تو ہی اے مطربِ مدہوش! مجھے بتلا دے
چوڑیاں بجتی ہیں پنگھٹ پہ کوئی آتا ہے
ہاں، اسی ساز پہ وہ نغمۂ رنگیں گا دے

سڑک بن رہی ہے!

مئی کے مہینے کا مانوس منظر
غریبوں کے ساتھی یہ کنکر یہ پتھر
وہاں شہر سے ایک ہی میل ہٹ کر ——— سڑک بن رہی ہے

زمیں پر کدالوں کو برسا رہے ہیں
پسینے پسینے ہوئے جا رہے ہیں
مگر اس مشقت میں بھی گا رہے ہیں ——— سڑک بن رہی ہے

مصیبت ہے کوئی مسرت نہیں ہے
انہیں سوچنے کی بھی فرصت نہیں ہے
"جمعدار" کو کچھ شکایت نہیں ہے ——— سڑک بن رہی ہے

جواں، نوجواں اور خمیدہ کمر بھی
فسردہ جبیں بھی، بہشتِ نظر بھی
وہیں شامِ غم بھی، جمالِ سحر بھی ——— سڑک بن رہی ہے!

"جمعدار" سائے میں بیٹھا ہوا ہے
کسی پر اُسے کچھ عتاب آگیا ہے
کسی کی طرف دیکھ کر ہنس رہا ہے ——— سڑک بن رہی ہے!

یہ بے باک اُلفت، یہ الھڑ اشارہ
"بسنتی" سے "رامو" تو "رامو" سے "رادھا"
"جمعدار" بھی ہے بسنتی کا شیدا ——— سڑک بن رہی ہے!

جو سر پہ پگڑی تو ہاتھوں میں ہنٹر
چلا ہے "جمعدار" کس شان سے گھر
"بسنتی" بھی جاتی ہے نظریں بچا کر ——— سڑک بن رہی ہے!

——— سمجھتے ہیں لیکن ہیں مسرور راب بھی
اسی طرح گاتے ہیں مزدور راب بھی
بہر حال واں حسبِ دستور راب بھی ——— سڑک بن رہی ہے!

ایک عورت

سبک دھانوں کے پیلے کھیت مغرب میں لہکتے ہیں
اور اس کے مشرقی گوشے میں شیشم کی قطاریں ہیں
شمالی جھاڑیوں میں جنگلی پودے مہکتے ہیں
اور اِک جانب کسی چھوٹے سے دریا کی بہاریں ہیں

پُرانے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھُلتے ہیں
یہیں اکثر گلابی چوڑیاں کچھ گنگناتی ہیں

(۲)

سنا ہے ایک دن شیشم کے اِن منحوس پیڑوں سے
کوئی سایہ اندھیرے میں سہاگن بن کے آیا تھا
اکیلے، اونچے اونچے، خشک اور مایوس پیڑوں سے
اسی زرد اور پھیکے چاند نے اک گیت گایا تھا

ندی کے اس کنارے پر جہاں کوئی نہیں جاتا
گھڑا بھرنے کی اب بھی نقرئی آواز آتی ہے

(۳)

یہ پیلا کھیت میں نے نرم برساتوں میں دیکھا ہے
کوئی ساون کا نغمہ پتیوں پر رقص کرتا تھا
یہی نظارہ میں نے چاندنی راتوں میں دیکھا ہے
کوئی بھدّا تخیّل جھاڑیوں میں رنگ بھرتا تھا

تو اُس کے بانس کے دروازے مشرق ہی میں کھلتے ہیں
سُبک دیواریں مٹی کی کئی جانب سے نیچی ہیں

(۴)

ہر اک تہوار میں سجتی ہیں یہ مٹی کی دیواریں
بہت سے سرخ۔ زرد اور سبز گل بُوٹے ابھرتے ہیں
سنائی پڑتی ہیں ہر صبح کو پائل کی جھنکاریں
پسِ دیوار اب بھی حوصلے مٹ کر سنورتے ہیں

ہر اک برسات میں کھپرے کی چھاجن بدلی جاتی ہے
کڑے جاڑوں میں باہر ٹٹیاں گنجان ہوتی ہیں

(۵)

سبک دھانوں کے پیلے کھیت اب بھی تھرتھراتے ہیں
کوئی نغمہ انہیں کے زرد تاروں پر مچلتا ہے
بہت سے جنگلی پودے نئی جھاڑی بساتے ہیں
وہی چھوٹا سا دریا آج بھی نرمی سے چلتا ہے

مگر اک صبح کو شیشم کے ان منحوس پیڑوں سے
گزرتی ہی چلی جاتی تھی جو صورت وہ پنہاں ہے

(نقوش)

مہینوں کے گیت

سنو، یہ چیت ہے اور تم سفر کو جانے والے ہو
بہار اپنی جوانی پر ہے
دیکھو، کیسا منظر ہے
چلو تم بھی کہ میں کچھ پھول مندر میں چڑھاؤں گی
چلو اک بات ان برگد کے سایوں میں بتاؤں گی
چلو وہ گیت جو تم کہہ رہے تھے آج گاؤں گی
یہ کیوں آنکھوں میں مستی ہے
شرارت کیوں ٹپکتی ہے
تو سمجھی، مجھ سے کچھ کہہ مجھے شرمانے والے ہو

(۲)

سنو، بیساکھ ہے اور تم یہ کہتے ہو کہ جائیں گے
ہوا گلشن میں گاتی ہے
چنبیلی مسکراتی ہے
چنبیلی کے انہیں پھولوں میں ہم تم کیوں نہ کھو جائیں
ہوا کی بانسری کی لے میں ہم کیوں گم نہ ہو جائیں
سویرا ہے دوبارہ آؤ پھلواری میں سو جائیں
سراپا حسرت و غم ہو
بتاؤ مجھ سے برہم ہو
قسم ہے باغ میں ایسے نظارے پھر نہ آئیں گے

(۳)

سنو، یہ جیٹھ ہے اور گاؤں سے رخصت کی ٹھانی ہے
یہ رنگوں کا مہینہ ہے
کہ اک نازک حسینہ ہے
ذرا قوسِ قزح کے رنگ میں ساری ڈبوؤں گی

میں اس دیوی کی خاطر چمپئی کلیاں پروؤں گی
شفق کی دادئ رنگیں میں تھوڑی دیر سوؤں گی!
محبت ہر طرف خنداں
فضا میں دھوپ کی رقصاں
وہاں پر نفرتی جذبات کی دلکش کہانی ہے

(۴)

سنو، پاوس ہے یہ اور تم نے بستر باندھ رکھا ہے
فضا میں آگ مدغم ہے
کوئی دوشیزہ برہم ہے
چلو دوشیزۂ برہم کو برہم اور کر آئیں
چلو ان گرم رخساروں کی کچھ افشاں اڑا لائیں
چلو تاروں کی چھاؤں میں سہانی نیند سو جائیں
تو گرمی سے پریشاں ہو
بڑے نازک ہو، ناداں ہو
یہ آنگن میں جو میں نے جوہی اور گیندا لگایا ہے!

(۵)

سنو، ساون ہے اور تم اندنوں بھی گھر سے جاؤ گے

پھواروں کا زمانہ ہے

بہاروں کا زمانہ ہے

چلو بالوں کے جھرمٹ میں یہاں سے دُور چھپ جائیں

چلو ندّی کنارے دھان کے کھیتوں میں کچھ گائیں

چلو مندر سے ہم گوپال کا جھولا چرا لائیں

فضا میں کام دیوتا نے

بہار رکھے ہیں مے خانے

کدم کے سائے میں بتلاؤ جھولا کب جھلاؤ گے!

(۶)

سنو، بھادوں کے دن ہیں اور تم کہتے ہو جانا ہے

صدا بنسی کی آتی ہے

کہ جمنا گیت گاتی ہے

یہ بارش اور یہ رُت عشق کا پیغام دیتے ہیں

اِنہیں رنگیں دنوں میں کرشن دیوتا جنم لیتے ہیں
وہ لے میں بانسری کی دو دلوں کی ناؤ کھیتے ہیں
چلو مندر میں ہو آئیں
دعائیں ہم بھی پا جائیں
ہماری الفتوں کا بھی دعاؤں کا زمانہ ہے؛

(۷)

سنو، یہ کوار ہے اور ان دنوں گھر سے روانہ ہو
مسرت ہے نہ برکت ہے
بڑی منحوس ساعت ہے
میں کیسے برہمن کو آج اکیلے میں کھلاؤں گی
میں اب پوجا بھی کرتے وقت شاید خوف کھاؤں گی
تصوّر سے اَجل کے میں قسم ہے کانپ جاؤں گی
بہاروں میں سنورتی ہوں
اداسی سے میں ڈرتی ہوں
مجھے تو آپ ہوں، ساون، ہو اور کوئی فسانہ ہو!

(۸)

سنو، کاتک ہے اور جانے کو تم تیار بیٹھے ہو
چراغوں کا زمانہ ہے
مجھے پوجا کو جانا ہے
چلو دیکھیں دئے کی لَو سے لکشمی کیسے آتی ہیں
چلو دیکھیں تو کیا ہر شمع میں جلوہ دکھاتی ہیں
چلو دیکھیں وہ کیسے ہر طرف سونا لٹاتی ہیں
اگر دیوی کو گھیریں گے
تو پھر سونا بکھیریں گے
مجھے معلوم ہے تم آج کتنا ہار بیٹھے ہو!

(۹)

سنو، اگہن کے دن ہیں اور سفر کی دُھن سمائی ہے
فضا شادی رچاتی ہے
کہ ندی گنگناتی ہے
کہو تو رام کی مورت میں سندل میں بھی بھر آؤں

کہو تو جانکی جی کی طرح میں بھی سنور آؤں
گلابی سردیوں میں اک دوشالہ اوڑھ کر آؤں
بہت کیف آفریں دن ہیں
ابھی جاڑے بھی کمسن ہیں
اگر ایسے میں تم گھر ہی رہو تو کیا بُرائی ہے!

(۱۰)

سنو، یہ پوس ہے۔ دیکھو، یہ سردی کا زمانہ ہے
یہ راتیں تیز جاڑے کی
یہ صبحیں نرم و نازک سی
ذرا دیکھو چمن کے کتنے کیف آگیں نظارے ہیں
یہی پھول اور کلیاں رات کے چاند اور تارے ہیں
یہی جاڑے کی راتوں میں مرے دل کے سہارے ہیں
مجھے کل اِن فضاؤں سے
مَہِ نَو کی ضیاؤں سے
دعا کے واسطے پو پھٹتے ہی مندر کو جانا ہے!

(۱۱)

سنو، یہ ماگھ ہے اور اِن دنوں تم گھر سے جاتے ہو
ہوائیں گیت گاتی ہیں
گھٹائیں چھائی جاتی ہیں
کھلا دالان ہے کھیتی بھی کٹ کر اس میں آئی ہے
چلو اُوپر چلیں پرسوں ہی تو مٹی لگائی ہے
رضائی چھینٹ کی کل ہی تو خوشبو میں بسائی ہے
چلو اک بات کرنا ہے
سحر کو رات کرنا ہے
تو جاؤ، چپکے چپکے زیرِ لب کیوں مسکراتے ہو!

(۱۲)

سنو، پھاگن ہے اب اگلے مہینے بمبئی جانا
فضا اِس درجہ رنگیں ہو
مگر تم ہو کہ غمگیں ہو
چلو کچھ پھول لیکر جلد پھلواری سے آؤں گی

ستی دیوی کی پُوجا کے لئے مندر میں جاؤں گی
"چلو مندر کے سائے میں خوشی کے گیت گاؤں گی"
ابھی تو سکھ منانا ہے
کمانے کو زمانا ہے
ہماری زندگی کا ہر نیا سال ایک افسانہ!

رقص

ایک دوشیزہ اندھیرے میں چلی آتی ہے
کوئی رقاص مرے کہنے سے اتنا کر دے
شرم اور خوف سے گھبرائے ہوئے پاؤں میں
ایک ادھورا ہی سا منظوم تخیل بھر دے

شام

(ایک چاپانی نظم سے متاثر ہوکر)

میری نظریں ہیں افق پر لیکن
میری آنکھیں نہیں رنگِ گل و نسریں کیلئے
سینۂ آب پہ عکسِ مہ و پروین کے لئے

(۲)

دیکھ اس شامِ خزاں کو اے دوست
کتنی افسردہ ہے اِس ڈوبتے سورج کی جبیں
اِس کے جھلسے ہوئے ہونٹوں پہ کوئی گیت نہیں

(۳)

اور وہ دریا کے کنارے پہ کوئی
جھونپڑا سا جو دھندلکے میں نظر آتا ہے
کتنا حیران ہے، خاموش ہے اور تنہا ہے

بھینٹ

ندی کے پار، یہ پیپل کا بوڑھا دیوتا اب بھی
کسی غمناک افسانے کا مجرم ہو ہی جاتا ہے

عقیدت سے یہاں نازک قدم تھرّا کے اُٹھے تھے
یہاں آتے ہوئے پازیب کی جھنکار بھی کم تھی
وہ آنچل مورتی کے سامنے لہرا کے اُٹھے تھے
یہاں دوشیزگی حُسنِ پرستار بھی کم تھی

کوئی الھڑ جوانی صبح کے پھولوں کی تھالی میں
لڑکپن کے حسیں خوابوں کی دنیا لیکے آئی تھی

امیدوں کی سنواری ایک تصویرِ خیالی میں
نسائیت یہاں خود جذب ہو کر مسکرائی تھی

تقدس کے حسیں شیطان کے قدموں کی آہٹ میں
یہاں دوشیزگی کی چیخ بھی گم ہو گئی آخر
گھنے پتّوں کے نیچے مورتی کی مسکراہٹ میں
ہمیشہ کے لئے بھولی پجارن کھو گئی آخر

اندیشہ

آرٹسٹ! اپنی یہ تصویر مکمل کر لے!
ہاں، یہ ہونٹ اور بھی پتلے ہوں، یہ آنکھ اور بھی مست
لیکن ان گالوں کی سرخی کو ذرا کم کر دے
میں نے شاید انہیں مرجھایا ہوا پایا ہے!
ہلکے آنسو سے اِن آنکھوں کو ذرا نم کر دے
میں نے افسردہ نگاہوں سے یہی سمجھا ہے!
آج بھی میں نے سرِ راہ اُسے دیکھا ہے ——!!
ایک شہ کار اسے جلد بنا لے اے دوست!
ورنہ تصویر کا خاکہ ہی بدلنا ہوگا ——!!!

ہاجرہ

یہ کیا کہ "میں غریب ہوں" بڑی ہی مردہ دل ہو تم
مری بہن تو ہو مگر بہت فسردہ دل ہو تم
مجھے بھی فکر، چاند آج مضمحل ہے، زرد ہے
تمہیں بھی سوچ، رُخ پہ کیوں تمہارے اتنی گرد ہے
مجھے بھی فکر، تم میں کیوں لطیف شوخیاں نہیں
تمہیں بھی غم، تمہارے پاس کیوں سہیلیاں نہیں
غریب و بدنصیب ہو، مگر یہ کیا ضرور ہے
"خوشی تو میرے بھائی جان! خواب سے بھی دُور ہے"
خوشی، یہی کہ قیمتی لباس زیبِ تن کروں
حسین زیورات سے نگارشِ بدن کروں

خوشی، یہی کہ پارٹی سے ہال کو سجاؤں گی
ہر ایک کام پر کسان عورتیں بلاؤں گی
خوشی، یہی کہ دل فریب ناولوں میں کھو رہوں
نہیں تو فلم کے حسین گیت گا کے سو رہوں

تمہیں بھی شوق ہے اگر یہی خوشی نصیب ہو
تو غم نہیں ہے ہاجرہ! مجھے کہ تم غریب ہو!

جہاں سبھی غریب ہوں وہاں تمہیں ملال کیوں
خود اپنے اضطراب میں سکون کا خیال کیوں
جو دل میں دکھ کی ٹیس ہے تو راحتوں کا شوق کیوں
ہجومِ اشک دیکھ کر تبسموں کا ذوق کیوں؟

بدلنے دو جہان کے اَلم فزا نظام کو
ابھی نہ غم زدہ کرو مری بہن! سلام کو ——؟!

سیّاح سے

یہ عمارات، یہ ایوان، یہ پتّھر کے نقوش
عہدِ ماضی کے ہیں شہ کار نہ دیکھ اے سیّاح!
یہ حسیں صبح، یہ ہر چیز میں "نیچر" کے نقوش
منظرِ وادی و گلزار نہ دیکھ اے سیّاح!

آ، اسی سر بفلک نُقرئی ایواں کے قریب
ڈائری کو تری اک اور بھی عنواں دیدوں
ہاں، اسی دلکشیِ صحنِ گلستاں کے قریب
تجھ کو تفریح کے کچھ اور بھی ساماں دیدوں

یہ جو کھیتوں سے چلی آتی ہے شیریں آواز
بھوک اور پیاس کا تھرّایا ہوا نغمہ ہے
جس نے کی ہے ابھی اسی سادہ فضا میں پرواز
مضطرب رُوح کا گھبرایا ہوا سایہ ہے

ہاتھ جمنا کو ابھی جس نے یہاں جوڑے ہیں
تجھ کو حیرت ہے کہ وہ آدمی مُردہ کیوں ہے
جس نے کچھ پھُول گلستاں سے ابھی توڑے ہیں
تُو نے پوچھا ہے وہ دوشیزہ فسردہ کیوں ہے

دیونا اور شہنشاہ کے سایوں ہی میں
یہ عمارات، یہ نظّارے پلے ہیں سیّاح!
انہیں ایوان و طرب گاہ کے سایوں ہی میں
کتنے اِنسان یہاں چیخ رہے ہیں سیّاح!

پوُجا

مَیں نے کیا پاپ کیا
میں نے کیا جُرم کیا
اے مرے نیلے کنول سے دیوتا ــــــ !؟
رنگِ بزمِ گل و مہتاب کبھی دیکھ لیا
نیند آئی تو حسیں خواب کبھی دیکھ لیا
نے نوازِ طربِ زیست ! میں یہ بھی نہ کروں
آرزو غم کے دُھندلکے میں خُوشی کی نہ کروں
مَیں نے کیا پاپ کیا
میں نے کیا جُرم کیا
اے مِرے نیلے کنول سے دیوتا ــــــ !؟

گیت اک درد بھی ہے اتنا تو سوچا ہوتا
اپنے نغموں کی فضاؤں میں بھی دیکھا ہوتا
مرا جو داغ کھِلا میرا جو آنسو چمکا
خود ترے چاند ستاروں نے اسے چھین لیا

مَیں نے کیا پاپ کیا
مَیں نے کیا جُرم کیا

اے مرے نیلے کنول سے دیوتا ——— !؟

کتنے نغماتِ محبّت کے لئے ساز نہیں
کتنی رادھاؤں کی پازیب میں آواز نہیں
دِل نے بے بربط و بے ساز بھی گانا چاہا
آنکھ نے غنچۂ غمگیں کو ہنسانا چاہا

میں نے کیا پاپ کیا
مَیں نے کیا جرم کیا

اے مرے نیلے کنول سے دیوتا ——— !؟

آپ ——؟

آپ شرما سی رہی ہیں مادام!
اس بلاؤز کو کسا ہونا تھا
کھُردرے گالوں کو نرمی کیلئے
غازے سے پہلے ذرا دھونا تھا

آپ گھبرا سی رہی ہیں مادام!
لوگ پہچان رہے ہیں شاید
آپ کیا سوچ رہی ہیں جی میں
دوست سب جان رہے ہیں شاید

آپ پچھتا سی رہی ہیں مادام!
بیچتی پھرتی نہ گر حسن و شباب
اپنی جیتی ہوئی نظروں سے مجھے
یوں تو آتا نہ سر بزمِ حجاب

غور فرما سی رہی ہیں مادام!
اب بھی یہ جسم جواں ہے میرا
اسی بازو، انہیں ہونٹوں کی قسم
آج بھی سارا جہاں ہے میرا ——!

انتشار

اے پراگندہ تصوّر! میں ابھی ہوں بیدار
لیکن اب دیر نہیں جلد ہی سو جاؤں گا
مجھ کو معلوم ہے اک خواب میں کھو جاؤں گا
اور ہو جاؤں گا زندانیٔ تسکین و قرار

نیم شب اور یہ خوابیدہ ستاروں کی قطار
جیسے اس روز کی اک بیتی ہوئی آدھی رات
جیسے ان ہونٹوں پہ کانپی ہوئی مبہم سی بات
جیسے بجھری ہوئی بحروں میں فسردہ اشعار!

یہ کتابیں، یہ رسالے، یہ پرانے اخبار
پا رہا ہوں بہ انداز محبت کا سراغ
ایسے موضوع پہ کیا کہتے ہیں دنیا کے دماغ
لیکن ان ٹھوس کتابوں سے پرے ایک پکار

ہر طرف چرخ پہ یہ برق، یہ آتش، یہ شرار
کیا فضاؤں میں محبت نہ کرے گی پرواز
ماہ و انجم پہ بھی چھائے ہیں یہ کم بخت جہاز
یاد آتے ہیں وہ تابندہ جبین و رخسار

میرے ماحول کی تاریک فضا آتش بار
میری نظروں میں ہے رقصندہ مرا مست شباب
میری آنکھوں میں ہے تابندہ مرا پیار اخواب
میرے جذبات کے ہاتھوں میں سکوں بخش ستار
—— لیکن اب دیر نہیں جلد ہی سو جاؤں گا!

پیتل کا سانپ

—— اور پیتل کا یہ زہریلا سانپ
جس کی نازک سی زباں پر یہ خنک شمع کی لَو
لہر کی طرح اندھیرے میں اٹھا کرتی ہے
میرے اک دوست نے تحفے میں مجھے بھیجا تھا!

یہ ہیں ٹیگورؔ کے بے ربط تخیّل کے نقوش
اور یہ چین کے نغمات کا مجموعہ ہے
میز کے گوشے میں رکھا ہوا "گوتم" کا یہ بت
تم کو اچھا نہ لگے گا شاید!

مُدتیں گزریں اسی کمرے میں جس میں ہم تم
گفتگو کرتے ہیں
اس جنگ پہ اس دنیا پہ
اور موجودہ ادب پر یہ خیالات کی رَو
آرٹ اور جنگ
ادب اور حیات

جنوری کی یہ حسیں رات اور اس پر اے دوست!
—— یہ مسہری جو پڑی ہے میری
جس کے بازو پہ یہ پیتل کے حسیں سانپ کا عکس
آج کی رات بھی لہراتا ہے
تم کوئی پریوں کا قصّہ تو نہ سمجھو گے اسے
میں اگر تم سے کہوں
یہ کہ پیتل کے اِسی سانپ نے کاٹا ہے اُسے
ایک معصوم سی دوشیزہ کو!

جنوری کی یہ حسیں رات اور اس پر اے دوست
میرے آراستہ کمرے کا نکھار
ایک پکار!

"سرد اور موت کی مانند اندھیری اک رات
بوندیں جاڑے کی
غریبی کے مسلسل آنسو
ایک عورت کی جبیں پر تارے
سرد تاریک ستارے یعنی
ایک دوشیزہ کے رخسار پہ بوسوں کے نشاں
نقرئی بوسے
طلائی بوسے!"

اب بھی ہر رات اسی کمرے میں
اسی شیشے کی سہری پہ کتابیں لیکر
چین کی نظموں کا مجموعہ

نقوشِ ٹیگور

اور کبھی

سادے کاغذ پہ خود اپنے ہی خیالوں کے لئے

ایک سکوں!

اپنے گناہوں کے لئے

ایک قرار

کچھ اِسی قسم کے افکار میں سب ڈوبا ہوا

سوچا جاتا ہوں بہر حال اے دوست!

میز پر رکھے ہوئے "بت" کے حسیں سائے ہیں!

اور پنسل کا یہ زہر یلا سانپ

شمع کوڈس کے سویرے ہی سے چلاّتا ہے

"جنگ

موت

اور گناہ ——————!!!

ناکامی

سمندر آسماں پر چھا رہا ہے
اچانک ایک طوفاں آگیا ہے ہر اک جانب اندھیرا چھا گیا ہے
شفق میں پھول سا لہرا رہا ہے

ابھی کچھ دُور ہے دُھندلی سی سُرخی
مگر طوفان بڑھتا جا رہا ہے ربابِ قہر پر تھرّا رہا ہے
شفق کے پھول نے انگڑائی لے لی!

نظارا موت کا مارا ہوا ہے
بساطِ آسماں کچھ نیلگوں ہے نہ طوفاں ہے نہ لہروں میں جنوں ہے
"گلِ رنگیں" کہیں گم ہو گیا ہے
سمندر آسماں سے ہٹ رہا ہے!

(نقوش)

جنگل کا ناچ

جنگلی لباس میں ایک پیکرِ گداز —— چل رہا ہے جھاڑیوں میں سانپ جھوم جھوم کر
اُڑ رہا ہے مور اپنے بال چوم چوم کر

جھیل مانگنے لگی شام کی ہوا سے ساز!

ایک بار —— تین بار
دستِ صندلی اُٹھے   پاؤں لہر کھا گئے
جسمِ ناز کے شرار
جھیل کے کنارے مست ہو کے ناچنے لگے —— جنگلی جوان شام کو سکون پا گئے
جھونپڑوں سے اپنے اپنے ساز لیکے آ گئے

آسماں سے چاند اور ستارے جھانکنے لگے!

چاندنی میں جاگ اُٹھی
سو رہی تھی صبح سے بول کیسے خواب تھے
میرے "بدھ" کی مورتی!

جھاڑیوں سے سُرخ، زرد پھول توڑ توڑ کر ——— ایک بار ——— تین بار اور اب تو بار بار
مورتی پہ جنگلی حسینہ کرتی ہے نثار

چشم و لب کے رقص پہ ہاتھ موڑ موڑ کر!

رقص کی شراب میں
سانپ مست ہو گیا اور مور سو گیا
عکسِ ماہتاب میں

ایک پیکرِ گداز اور ناچنے لگا ——— ڈھولکوں کی مست چیخ اور تیز ہو گئی
جنگلی حسینہ اور شعلہ ریز ہو گئی

مورتی کا دیوتا خود ہی مسکرا اُٹھا!

اور جیسے چونک کر
رقص بند ہو گیا کس قدر غرور تھا
کامیاب رقص پر!

پلکوں کی چھاؤں میں

تُم سمجھتی ہو کہ ہر نظم ہے ممنُون مری
انہیں پلکوں، انہیں ہونٹھوں، انہیں رخسارونکی

اور ــــ جو رات کو لیکر یہی مدھم سا چراغ
دیکھتی رہتی ہو نمناک نگاہوں سے مجھے
میری ہر سرد خموشی پہ بظاہر ہنسکر
بھینچ لیتی ہو جو اکثر انہیں باہوں سے مجھے

اور ــــ اکثر سرِ آئینہ دمِ آرائش
یک بیک پھُول سا چہرہ جو اتر جاتا ہے
سوتے سوتے مرے رومان کو غم گیں پاکر
ہر حسین خواب تمہارا جو بکھر جاتا ہے

تم نے دیکھا ہے، یہ شیریں لب و رنگیں رخسار
میرے ہر پیار پہ کچھ سرد سے ہو جاتے ہیں
تم نے محسوس کیا ہے بڑی مدھم لَے میں
ماہ و انجم شبِ خاموش میں کیا گاتے ہیں؟

اِن گھنی پلکوں کی چھاؤں ہی میں نَم اور خنک
جھلکیاں اور بھی ہیں حُسن کے نظاروں کی!

نقش

ایک نقّاش لئے بیٹھا ہے رنگ اور قلم
اور کچھ دور، بھکاری کی صدا آتی ہے
بھیک دیتے ہوئے معصوم حسینہ کی نظر
ایک مفلس کی جوانی سے بھی شرماتی ہے

تھیسس

میں نے مانا کہ مجھے آپ نے دیکھا ہی نہیں
آپ تو منظرِ رنگیں کی طرف راغب تھیں...

جی میں سمجھا کہ تبسّم سی کوئی شے ہی نہ تھی
جنبشیں ہونٹوں کی اس بھول کی بس جا تھیں

رُکیے رُکیے کہ مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے
زحمتِ خاص گوارا تو کریں گی شاید

اور پھر ایسے صنوبر کی گھنی چھاؤں میں
مجھسے ملتے ہوئے اسوقت ڈریں گی شاید

یہ تصوّر کہ مجھے آپ سے کچھ الفت ہے
میں نے مانا کہ غلط بھی نہیں اتنا لیکن

یہ کہ بے حس ہوں سوا عشق کے کچھ کام نہیں
ہم پریشان جوانوں کے لئے ناممکن

تجھ کو جینا ہے مسرت کے لئے جینا ہے
اور خوشی حسن کے اس سایۂ عشرت میں نہیں

کانپتی لہروں پہ پائندہ حبابوں کا خیال
میرے اس خواب کی تعبیر محبت میں نہیں

صرف اتنا کہ گلابی سا کوئی خط اب تک
میری بکھری ہوئی فائل میں کہیں رکھا ہے

وہ اگر آپ کا خط ہے تو بصد فخر مجھے
شکریہ بندہ نوازی کا ادا کرنا ہے

اب بڑے شوق سے اُس پار گھنے پھولوں میں
قہقہہ میری محبّت پہ لگا سکتی ہیں

میری اِن باتوں سے گھبرا بھی گئی ہوں شاید
جی میں آئے تو بڑے شوق سے جا سکتی ہیں

شرائط

بجا کہ کھیل رہا ہوں شباب سے اپنے
بجا کہ دن مری "شادی" کے بھی ہیں آئے ہوئے

خطا معاف کہ جچتی نہیں نگاہوں میں
یہ دیویاں پسِ چلمن نظر جھکائے ہوئے

مجھے تو ہمدم و ہمراز چاہئے ایسی
جو دستِ ناز میں خنجر بھی ہو چھپائے ہوئے

نکل پڑے سرِ میداں اڑا کے آنچل کو
بغاوتوں کا مقدّس نشاں بنائے ہوئے

اٹھا کے ہاتھ کہے "انقلاب زندہ باد!"
لہو سے مثلِ دلہن مہندیاں رچائے ہوئے

سہیلیوں کو بھی ساون کے گیت کے بدلے
وطن کے گیت سنائے علَم اٹھائے ہوئے

حسین جسم کو سونے کے زیوروں کے عوض
سنان و خنجر و پیکاں سے ہو سجائے ہوئے

اجل سے بات کرے زندگی کے پہلو پر
خود اپنی موت کو اک زندگی بنائے ہوئے

جو کامیاب ارادوں میں اپنے ہو جاؤں
خوشی کے گیت سنائے گلے لگائے ہوئے

غرض — اک ایسی ہی ہم راز و ہم نوا کی شبیہہ
بہت دنوں سے تصور میں ہوں بسائے ہوئے

قُلی

سر سے بوجھ اتار کر ساتھ چھوڑتے ہوئے
اِک ذلیل کی طرح ہاتھ جوڑتے ہوئے
وہ بہت ادب سے جب دام مانگنے لگا
میرا دل اور غرور برہمی سے بھر گیا
کیوں نحیف و نیم جاں کیڑے کو مسل نہ دوں
کیوں ذلیل و بد نصیب کتّے کو کچل نہ دوں
بُزدلی و بے حسی، مفلسی کے روپ میں
اِک ذلیل جانور، آدمی کے روپ میں
جرأت اتنی بھی نہیں بڑھ کے شاخ موڑ لے
اپنی محنتوں کا پھل مسکرا کے توڑ لے

جنگ

اُڑ رہے ہیں بڑی تیزی سے بلندی پہ جہاز ——— !!!
برق و آتش کی مشینیں کہ ہماری چیخیں !!
ابھی سرسبز زمینوں پہ یہ چھا جائیں گی
ابھی معصوم نگاہوں کو کریں گی حیراں
پھُول کچھ گلشنِ تہذیب کے برسائیں گی
اور آغوش میں محسوس کرے گا اِنساں
خون ۔ موت ۔ آگ ۔ شرر اور دھواں ——— !!!
پھر بھی سرسبز زمینوں پہ اُگیں گے پودے
اور تیزی سے کریں گی یہ مشینیں پرواز ——— !!!

ٹوٹا ہوا ریکٹ

پانی کا ایک بلبلا جیسے
حد سے زیادہ پھول گیا ہو
میلا سا اک قمقمہ جیسے
کوئی فضا میں بھول گیا ہو
جیسے اک ننھا سا غبارہ اڑتا ہو اور کچھ گاتا ہو
دن میں ایک بڑا سیارہ دو جانب آتا جاتا ہو
صاف زمیں پر جال ہے اس پر دل کی اک دنیا اڑتی ہے
یہ زہرہ کی گیند نہیں ہے، یہ میری آشا اڑتی ہے
امرت رکھنے والی ناگن
جال اور گلکاری کا پھن

حرکت کی آتی ہے آہٹ
وہ اٹھا اک "نازک ریکٹ"

گاہے اچھا ہاتھ لگا کر　　اپنے اوپر اتراتی ہیں
گاہے ضربیں خالی پا کر　　غصّے میں شرما جاتی ہیں

دوسری جانب کھیلنے والے پہلے خود موقع دیتے ہیں
کچھ لمحے کے بعد ہرا کر غصّے کی لذّت لیتے ہیں
کالج کے رومانی لڑکے پاس ہی سے آتے ہیں جاتے ہیں
دیکھ کے "ٹینس لان" کی جانب سہگل کے گانے گاتے ہیں

پوچھ رہی ہیں ساتھی سے وہ، بولو کیسا کھیل رہی ہوں
سوچ رہی ہیں اپنے جی میں سب سے اچھا کھیل رہی ہوں

ہاں یہ کیسی گیند کی تیزی
کیا اب کھیل ترقی پر ہے
یہ متواتر ضربیں کیسی
کیا مقصود اپنا جوہر ہے

لیکن یہ کیا کھیلنے والے کیسے اچانک رک سے گئے ہیں
کچھ ہنس کر کچھ پوچھ رہے ہیں، کچھ زہرہ کو دیکھ رہے ہیں
چپ ہیں وہ، ماتھے پر جیسے ان کے پسینہ چھوٹ گیا ہے
کھیلتے کھیلتے جانے کیسے ان کا ریکٹ ٹوٹ گیا ہے
..."ٹینس لان" پہ جاؤں کیسے میں کب اس سوسائٹی کا ہوں
بس ان کا "ٹوٹا ہوا ریکٹ" دور ہی میں دیکھ رہا ہوں!

قیدی عالمِ سکرات میں

— تو کیا قریبِ موت ہوں؟
نہیں نہیں، ابھی نہیں!
ابھی اسیرِ دام ہوں
نہیں، ابھی غلام ہوں
ابھی مری نگاہ کو یہ کائنات چاہیئے
اجل کی آرزو نہیں مجھے حیات چاہیئے
تو موت! دُور ہو کہ میری زندگی ضرور ہے
مجھے اسیر جان کر تجھے بڑا غرور ہے
ندی کی دھاروں کی قسم
انہیں نظاروں کی قسم
جو حریت نواز ہیں
بغاوتوں کے راز ہیں

وہ آہِ شعلہ بار ہوں کہ آسماں دہل اُٹھے
وہ آگ ہوں شرار ہوں کہ اک جہان جل اُٹھے

بہارِ جنگ آگئی
ہر ایک کو جنون ہے
زباں پہ باغیوں کے صرف
خون۔ خون۔ خون ہے!!!
الم کا خاتمہ ہوا
کہ قید خانہ جل گیا
ہمیں اب اور فکر کیا
چلو وطن چلیں ذرا
سوئے چمن چلیں ذرا—!
چمن بھی نغمہ زا ہے آج
گلوں کی یہ صدا ہے آج انقلاب۔ انقلاب!
وطن بھی کہہ رہا ہے آج انقلاب۔ انقلاب!

نئی بہار نے کہا خوش آمدید، باغیو!
گلوں کے ہار نے کہا خوش آمدید، باغیو!

بڑا ہی خوش نصیب ہوں
وطن سے اب قریب ہوں
یہ پیپلوں کی دھوپ چھاؤں
اے مرے حسین گاؤں!

کہاں ہے میرا جھونپڑا
میں آگیا۔ میں آگیا .....

مال روڈ ــــ لکھنؤ

بہت ہی دلفریب ہیں نظارے مال روڈ کے
یہ پیلی پیلی دیویاں
یہ اُجلی اُجلی لیڈیاں
یہ زرد زرد ساریاں
یہ ننگی ننگی پنڈلیاں
یہ جھینپی جھینپی آرزو
یہ خنداں خنداں گفتگو
یہ پنہاں پنہاں سا بدن
یہ عریاں عریاں سا بدن
یہ حسنِ جسمِ نقرئی، یہ شوخیاں، یہ دلبری
یہ پیشہ ور ہی لیڈیاں بہت بھلی ہیں جعفریؔ

لے میرے ایک دوست

ہزار بے نقاب ہوں مسرتیں نصیب ہیں
ہزار بے حجاب ہوں فراغتیں نصیب ہیں
فراغتوں کی دلکشی
کہ جیسے رقصِ زندگی
رواں دواں جوانیاں
جوانیوں کی مستیاں
جوانیوں میں سُرخ سبز بجلیوں کی چھاؤں ہے
یہیں ہماری زندگی کی تلخیوں کی چھاؤں ہے
جوانیوں کی دھوپ میں
حسینوں ہی کے روپ میں
مچل رہی ہے زندگی
ہر ایک سمت جعفری!
اجل — ارے ابھی نہیں
سہارا لینے دو کہیں
بہت ہی دلفریب ہیں نظارے مال روڈ کے —!

پناہ

میں اضطراب کے عالم میں مر نہیں سکتا
پناہ لیکے رہوں گا انہیں فضاؤں میں

اگر زمین کی رعنائیاں بھی پا نہ سکا
میں آسماں کے نظاروں کے گیت گاؤں گا
اگر چمن میں بھی کلیوں کو چھو نہیں سکتا
میں چاند اور ستاروں کے گیت گاؤں گا

(۲)

جو بزم میں مری نظموں کو ساز مل نہ سکا
کسی حسینہ کی آواز لے کے آؤں گا
انہیں جو محفلِ احباب میں جگہ نہ ملی
کسی کے رقص کی پرواز لیکے آؤں گا

(۳)

یہ بے حسی کے مظاہر اگر بدل نہ سکے
جوانیوں کی نئی بزم ڈھونڈھ لاؤں گا
مرے قریب کی باہیں یونہی جو سرد رہیں
میں روئے شوخ و لبِ گرم ڈھونڈھ لاؤں گا

(۴)

مرے نقوشِ تخیّل جو صاف ہو نہ سکے
کسی جوان مصوّر کے رنگ بھر دوں گا
جو گیت اور اداس در اداس ہوتے رہے
میں ساز اور رواں اور تیز کر دوں گا

(۵)

اگر حیات کی یہ تلخیاں بھلا نہ سکا
عروسِ جام کی پرچھائیوں میں دم لوں گا
اگر رگوں میں مسرّت کی گرمیاں نہ رہیں
کسی حسینہ کی انگڑائیوں میں دم لوں گا

(۶)

جو جل سکے نہ ذرا دیر مسجدوں میں چراغ
شبِ گناہ کی تاریکیوں میں سو لوں گا
مجھے جو سایۂ رحمت میں بھی جگہ نہ ملی
تھکا ہوں نفس کی رعنائیوں میں سو لوں گا

(۷)

جو سازِ انجم و مہتاب بھی شکستہ رہے
کسی مشیّن کے پرشور راگ بھر دوں گا
اگر یہ پھول، یہ کلیاں فضا پہ چھا نہ سکیں
ابھی میں خود ہی گلستاں میں آگ بھر دوں گا

— غبار چھٹتے رہیں گے یونہی منازل کے
چراغ جلتے رہیں گے انہیں ہواؤں میں!

سپیشل ٹرین

دھوئیں میں شام کے پنہاں تھے جنگ کے بادل
کہ اڑ رہے تھے فضاؤں میں سُرمئی گیسو
—— ٹرین گاؤں سے ہو کر گزرنے والی تھی
مسافروں کے تصوّر کا بار اٹھائے ہوئے!
نہ جانے کتنے ہی آنسو، نہ جانے کتنے چراغ
اِنہیں اُداس منڈیروں پہ جھلملائے ہوئے
کسی جوان حسینہ کا غم چھپائے ہوئے ——!!
—— وہ سبز کھیتوں سے ہو کر گزر گئی لیکن
فضا میں بکھری ہوئی تھیں شکستہ آوازیں ——!!!

نغمۂ خواب

جوان مطرب کو کیا ہوا ہے — سویرے سے ملگجے دیئے میں
ندی کے اُس پار جھونپڑے میں
ستار کے تار کس رہا ہے
— جوان مطرب ستار پر یہ حسین نغمہ سُنا رہا ہے
"جو کوئی ایسے میں چونک اُٹھے
اچانک اِک خوابِ دلنشیں سے
میں ملکۂ خواب کو اڑا کر
خود اپنے نغمے کے بازوؤں پر
شفق کے اُس پار گھوم آؤں
جبینِ افلاک چوم آؤں"

تصوّرِ دل نشیں کو آخر — حسین نغمے کی شان دے کر
تصوّرِ مرمریں کو آخر — جوان مطرب نے جان دے کر

قریب اپنے بلا لیا ہے
خدائے نغمہ بنا لیا ہے
اور ایسے میں صبح کی شعاعوں پہ اور تیزی سے گا رہا ہے —!!

(نقوش)

رُومال کے پھُول

آپ جلدی میں تھیں اس واسطے جیسے بھی بنا
سادے کپڑے ہی میں کچھ پھُول مجھے بخش دئے

اور بکھرے ہوئے پھُولوں میں بھی خوشبو پاکر
میرے ترسے ہوئے ہاتھوں سے وہ سب تھام لئے

اس پہ یہ سبز لکیریں۔ یہ گلابی نقطے
جیسے ہلکی سی کوئی قوس قزح کی تحریر

جیسے یہ پھُول، یہ شاخیں مرے بے جان خیال
جیسے بکھری ہے چمن میں مرے غم کی زنجیر!

شکریہ، آپ نے بخشے تو یہ کچھ پھُول مجھے
جی میں آتا ہے گلستاں ہی بنالوں ان کو

آپ کے لطف کا احساس اگر جُرم نہ ہو
اپنے نغمات کا عنواں ہی بنالوں ان کو

"چھتر منزل" کے اندھیرے میں چمکنے کیلئے
نقرئی پھولوں کے سائے میں دمکنے کے لئے
دھیرے دھیرے سوئے دریا ہی چلی آتی ہے ——!!

اجنبی رُوپ میں کوئی انساں
اپنے پائپ کا دھواں دیکھ رہا ہے شاید
دُور —— پُورب سے اُبھرتے ہوئے ہلکے ہلکے
چند شعلوں کے نشاں دیکھ رہا ہے شاید
—— دیکھ اب ان کی لپک تیز ہوئی جاتی ہے
آ، مرے ساتھ، کہ یہ آگ بجھا دیں چل کر!
تُو اگر زندہ ہے۔
پھر "شامِ اودھ" آئے گی
مَیں اگر زندہ ہوں
نفرت نہ کروں گا تجھ سے ——!!

مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!

پہلے جب دل رکھ ہی لیا تھا، آپ نے پھر دل توڑا کیوں؟
پہلے جب تھی آس بندھائی، آپ نے پھر منہ موڑا کیوں؟
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے! ——————
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!!

میں نے آپ کو خط بھیجا تھا　　آپ نے بھی زحمت کی تھی!
میں نے بھی اپنا سمجھا تھا　　آپ نے بھی اُلفت کی تھی!
آپ کا رنگیں خط آیا تھا　　مَیں نے بھی جرأت کی تھی
آپ نے میرا دل رکھا تھا　　مَیں نے بھی حسرت کی تھی

اب جب میرا دل مضطر ہے، یہ روپوشی کیا معنی؟
اب میرے ہر خط کے بدلے، یہ خاموشی کیا معنی؟
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے ——————
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!!

"جون" کی رومانی راتوں میں　　رنگیں نظمیں کہتا تھا
یعنی اپنی ہی باتوں میں　　کچھ کھویا سا رہتا تھا

ہاں یاد آیا، آپ کو میں نے اپنا "نغمہ" بھیجا تھا
آپ نے کچھ دن بعد اُسی کو اپنی دُھن میں گایا تھا
"جب بھی دیکھو کھوئے کھوئے، پژمردہ سے رہتے ہو"
آپ نے پوچھا تھا "پھر کیسے ایسی نظمیں کہتے ہو؟"

کچھ دن پہلے آپ مرے نغمات سے کھیلا کرتے تھے
بھولے سے اِک شاعر کے جذبات سے کھیلا کرتے تھے
اب جب مَیں نے دُکھ میں رنگیں نظمیں کہنا چھوڑ دیا
بیکس کا دِل رکھنا کیسا، آپ نے بھی دِل توڑ دیا
مُجھکو آپ سے شکوہ ہے ——————
مُجھکو آپ سے شکوہ ہے !!

مَیں بھی اک دولت والا ہوں آپ نے شاید سمجھا تھا
مَیں بھی نازوں کا پالا ہوں آپ کو شاید دھوکا تھا
اچھی صحبت ہے، شاعر ہوں اور فسانے لکھتا ہوں
بیس برس کا ایک جواں ہوں، شوخ طبیعت رکھتا ہوں
—— آپ نے یہ سب سمجھا مجھکو اور مجھے مانوس کیا
اب جب میری حالت دیکھی، دِل توڑا، مایوس کیا
مُجھکو آپ سے شکوہ ہے ——————
مُجھکو آپ سے شکوہ ہے !!

دولت، ثروت، عزت سے تو اُلفت کو کچھ کام نہیں
اُلفت کی افسردہ راتیں، شادی کے ایام نہیں

آپ کو دولت سے اُلفت ہے، میں اِس سے آگاہ نہیں
آپ کو اب مجھ سے نفرت ہے، خیر، مجھے پرواہ نہیں

آپ یونہی سرگرمِ خوشی ہوں اور طبیعت شاد رہے!
اچھا اب خاموش ہوں، چپ ہوں لیکن اتنا یاد رہے!

مجھکو آپ سے شکوہ ہے ——————
مجھکو آپ سے شکوہ ہے !!

بنگال کی رقاصہ

—— آپ بنگال سے کل آئی ہیں
آپ کو گانے سے دلچسپی ہے
جی —— تو کچھ رقص بھی فرماتی ہیں ؟
اور —— ؟
بیٹھئے —— آپ کو کیا پیش کروں ؟
چائے کا وقت تو ہے !
—— جی، یہ ٹیگور کی تصویریں ہیں !
دو منٹ، آپ اگر معاف کریں
منتظر آج کا اخبار ہے میرا —— لیکن
بھوک اور موت کی تصویروں میں کیا رکھا ہے۔

ان لکیروں میں تو مُبہم سا کوئی رنگ نہیں
یہ لکیریں تو سمجھ میں مری آجاتی ہیں ——!
انہیں سوکھے ہوئے اجسام کے پس منظر ہیں۔
ایک ٹینک، اک جہاز، ایک زنجیر ——!!!

آیئے چائے پئیں
یہ حسین سٹ "مرے ایک دوست نے کلکتے سے
جنگ سے پہلے مجھے عید کے دن بھیجا تھا
سبز، ہلکی سی لکیروں میں گلابی نکتے
دُور سے کتنے بھلے لگتے ہیں ——!
ان لکیروں کے بھی کچھ معنی ہیں
اور بکھرے ہوئے نقطوں کے بھی
دُور سے کتنے بھلے لگتے ہیں
پاس سے آنکھ جلی جاتی ہے
ہاتھ جلے جاتے ہیں

چند افسردہ نسیں، چند تڑپتی آنکھیں ——— !
برق کی خونی شعاعیں کہ بموں کے ٹکڑے ——— !!!

جی ——— یہ پیانو مرے اک دوست کا ہے
آپ گائیں گی؟
بہت خوب ——— مگر
پہلے اک رقص کہ یہ فن بھی تو پروردہ ہے
میرے بنگال، مرے ملک کے دیوتاؤں کا ——— !
ناچئے، ناچئے
دیوداسی کی پرستش کی طرح
چاند اور تاروں کی لرزش کی طرح
ناچئے ناچئے ——— پائل کے بغیر
جسم عُریاں ہی رہے
شعلہ افشاں ہی رہے
ناچئے، ناچئے

بھوک اور موت کا رقص

میرے بنگال کا رقص

ناچیئے۔ سوچتی کیا ہیں ——— اُٹھیئے!

آپ بنگال سے کل آئی ہیں۔

نغمہ و رقص کا پیکر بن کر

جسم کو بیچنے ——— پتھر بن کر

ناچیئے۔ ناچیئے ———

میں پاگل ہوں۔

یونہی بکا کرتا ہوں ——— !